# شذرات

سید منظور الحسن

# وحی اور فطرت کا باہمی تعلق

## جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا تقابلی مطالعہ

(۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فلسفۂ اخلاقیات کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی کے مابین فرق کو جاننے کے لیے کوئی اساس اور بنیاد موجود ہے؟

استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و شر کا احساس انسان کی فطرت میں روز اول ہی سے ودیعت ہے۔ اس احساس کی بدولت وہ نیکی اور بدی کو اسی طرح الگ الگ پہچانتا ہے، جس طرح آنکھیں دیکھتی اور کان سنتے ہیں۔ استاذ گرامی نے اس ضمن میں سورۂ شمس (۹۱: ۷-۸) کی آیات 'وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا' (اور نفس گواہی دیتا ہے، اور جیسا اسے سنوارا، پھر اس کی نیکی اور بدی اسے سجھا دی) سے استدلال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”... قرآن نے اِن آیتوں میں واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اُسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔ وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُس کے دل و دماغ میں

الہام کر دیا گیا ہے۔‘‘(میزان ۲۰۲)

غامدی صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ فطری احساس اس دین کے لیے اساس کی حیثیت رکھتا ہے جو وحی کے ذریعے سے اسے ملا۔ چنانچہ ان کے نزدیک شریعت کے اوامرونواہی دین فطرت کے عین مطابق اور اسی کی اساس پر مبنی ہیں۔ اپنی تصنیف ’’میزان‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’...پورا دین خوب و ناخوب کے شعور پر مبنی اُن حقائق سے مل کر مکمل ہوتا ہے جو انسانی فطرت میں روز اول سے ودیعت ہیں اور جنھیں قرآن معروف اور منکر سے تعبیر کرتا ہے۔ شریعت کے جو اوامرونواہی تعین کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ اِن معروفات و منکرات کے بعد اور اِن کی اساس پر قائم ہیں۔ اِنھیں چھوڑ کر شریعت کا کوئی تصور اگر قائم کیا جائے گا تو وہ ہر لحاظ سے ناقص اور قرآن کے منشا کے بالکل خلاف ہو گا۔‘‘(۴۸)

علماے امت کا موقف بھی یہی ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع نے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے واضح کیا ہے:

’’... اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر اور بھلے برے کی پہچان کے لیے ایک استعداد اور مادہ خود اس کے وجود میں رکھ دیا ہے جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا: ’فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا‘ یعنی نفس انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے فجور اور تقویٰ، دونوں کے مادے رکھ دیے ہیں۔‘‘(معارف القرآن ۸/ ۷۵۱)

مولانا امین احسن اصلاحی نے تحریر کیا ہے:

’’...بدی کا بدی ہونا اور نیکی کا محبوب ہونا اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرما دیا ہے۔ انسان اگر بدی کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدی کے شعور سے محروم ہے، بلکہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بدی کو بدی جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرتا ہے۔‘‘(تدبر قرآن ۹/ ۳۷۵)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مذکورہ آیات کی شرح میں لکھتے ہیں:

’’الہام کا لفظ ’لھم‘ سے ہے جس کے معنی نگلنے کے ہیں۔ ’لَهَمَ الشَّيْءَ وَالْتَهَمَهُ‘ کے معنی ہیں فلاں شخص نے اس چیز کو نگل لیا۔ اور ’اَلْهَمْتُهُ الشَّيْءَ‘ کے معنی ہیں میں نے فلاں چیز اس کو نگلوا دی یا اس کے حلق سے اتار دی۔ اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا کسی خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفس انسانی پر اس کی بدی اور اس کی نیکی و پرہیز گاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی، دونوں کے رجحانات و میلانات



www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

> رکھ دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز برائی، اچھے اخلاق و اعمال اور برے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فجور (بدکرداری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (برائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں، بلکہ اس کی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے برے اور بھلے کی تمیز پیدایشی طور پر اس کو عطا کر دی ہے۔ یہی بات سورۂ بلد میں فرمائی گئی ہے کہ 'وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ'، ''اور ہم نے اس کو خیر و شر کے دونوں نمایاں راستے دکھا دیے'' (آیت ۱۰)۔ اسی کو سورۂ دہر میں یوں بیان کیا گیا ہے: 'اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا'، ''ہم نے اس کو راستہ دکھا دیا خواہ شاکر بن کر رہے یا کافر'' (آیت ۳)۔ اور اسی بات کو سورۂ قیامہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نفس لوامہ (ضمیر) موجود ہے جو برائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے (آیت ۲) اور ہر انسان خواہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے، مگر وہ اپنے آپ کو خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے (آیات ۱۴-۱۵)۔'' (تفہیم القرآن ۶/ ۳۵۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس کے بعد اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا یہ احساس عملاً خیر اور شر کے مابین امتیاز قائم کرنے میں کس حد تک انسان کے لیے کارآمد ہے؟ آیا انسان کی فطرت اس کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتی یا اس کے برعکس، وحی کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر ہر لحاظ سے مکمل رہنمائی کی اہلیت رکھتی ہے یا ان دونوں کے بین بین کوئی صورت حال ہے؟

غامدی صاحب کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی فطرت میں دو چیزیں ازل ہی سے ودیعت ہیں: ایک اللہ کی ربوبیت کا اقرار ہے اور دوسری خیر و شر، یعنی نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ پہلی چیز درحقیقت اس واقعے کا اقرار ہے جو نفوس انسانی کی تخلیق کے موقع پر زمانۂ ازل میں رونما ہوا تھا۔ اس موقع پر تمام نوع انسانی نے اس بات کی گواہی دی تھی کہ اللہ ہی ان کا پروردگار ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ اعراف (۷) کی آیات ۱۷۲-۱۷۴ میں اس واقعے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق پروردگار نے تمام انسانوں سے پوچھا تھا کہ 'اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟' (کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں)؟ اس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا: 'بَلٰى، شَهِدْنَا' (ضرور، آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اِس پر گواہی دیتے ہیں)۔ اس واقعے کی حقیقت انسان کی فطرت میں پوری طرح مسلم ہے۔ دوسری چیز خیر و شر کا شعور ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کے تصور کو انسان کی فطرت اور اس کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا ہے۔ سورۂ شمس (۹۱) کی آیات ۷-۸، سورۂ دہر (۷۶) کی آیت ۳ اور سورۂ بلد (۹۰) کی آیت ۱۰ سے اسی بات کی

وضاحت ہوتی ہے۔ ان دونوں معاملوں میں انسان کا فطری علم اور شعور اس کی بنیادی رہنمائی کی خدمت بہ خوبی سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''قرآن بتاتا ہے کہ خدا کی ربوبیت کا اقرار ایک ایسی چیز ہے جو ازل ہی سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ معاملہ ایک عہد و میثاق کی صورت میں ہوا ہے۔ اِس عہد کا ذکر قرآن ایک امرِ واقعہ کی حیثیت سے کرتا ہے۔ انسان کو یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اِس لیے یہ واقعہ تو اُس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اِس کی حقیقت اُس کے صفحۂ قلب پر نقش اور اُس کے نہاں خانۂ دماغ میں پیوست ہے، اِسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اِسے یاد دلایا جائے تو وہ اِس کی طرف اِس طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے، درآں حالیکہ اُس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، اور اِس یقین کے ساتھ لپکتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اُس کو جانتا تھا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا یہ اقرار اُس کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب تھا جو اُس کے اندر ہی موجود تھا۔ اُس نے اِسے پا لیا ہے تو اُس کی نفسیات کے تمام تقاضوں نے بھی اِس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پا لی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ انسان کے باطن کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے، ہر شخص مجرد اِس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور میں جواب دہ ہے۔ فرمایا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى، شَهِدْنَا، اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ، اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ، اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ؟ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ، وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ.(الاعراف ۷: ۱۷۲-۱۷۴)

''(اے پیغمبر)، اِنھیں وہ وقت بھی یاد دلاؤ، جب تمھارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی نسل کو نکالا اور اُنھیں خود اُن کے اوپر گواہ ٹھیرایا تھا۔ (اُس نے پوچھا تھا): کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں، (آپ ہی ہمارے رب ہیں)، ہم اِس کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اِس لیے کیا کہ قیامت کے دن تم کہیں یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اِس بات سے بے خبر ہی رہے یا اپنا یہ عذر پیش کرو کہ شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے پہلے سے کر رکھی تھی اور ہم بعد کو اُن کی اولاد ہوئے ہیں، پھر کیا آپ اِن غلط کاروں کے عمل کی پاداش میں ہمیں ہلاک کریں گے؟ ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں، اِس لیے کہ لوگوں پر حجت قائم ہو اور اِس لیے کہ وہ رجوع کریں۔''''

(میزان ۹۱-۹۲)

”وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا، فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا، قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا، وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا.(الشمس ۹۱: ۷-۱۰)

”اور نفس اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی بدی اور نیکی اُسے سجھا دی کہ روز قیامت شدنی ہے، (اِس لیے) فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اُسے آلودہ کر ڈالا۔“

انسان کے لیے خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ فلسفۂ اخلاق کا سب سے بنیادی سوال ہے۔ قرآن نے اِن آیتوں میں واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اُسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔ وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُس کے دل و دماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر یہی حقیقت 'اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ'[1] (ہم نے اُسے خیر و شر کی راہ سجھا دی) اور 'هَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ'[2] (ہم نے کیا اُس کو دونوں راستے نہیں سجھائے؟) کے الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالم گیر حقیقت ہے۔ چنانچہ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اُسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دینے کے بعد اُس کی لاش چھپانے کی کوشش کی تھی تو ظاہر ہے کہ احساس گناہ ہی کی وجہ سے کی تھی۔ یہی معاملہ نیکی کا ہے۔ انسان اُس سے محبت کرتا ہے، اُس کے لیے اپنے اندر عزت و احترام کے جذبات پاتا ہے اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے، اُس میں حق و انصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اِس امتیاز خیر و شر کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ برائی کے حق میں انسان بعض اوقات بہانے بھی تراش لیتا ہے، لیکن جس وقت تراشتا ہے، اُسی وقت جانتا ہے کہ یہ بہانے وہ اپنی فطرت کے خلاف تراش رہا ہے، اِس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اُس کے ساتھ کر بیٹھے تو بغیر کسی تردد کے وہ اُسے برائی ٹھیراتا اور اُس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: نیکی حسن اخلاق ہے اور گناہ وہ ہے جو تمھارے دل میں کھٹک پیدا کر دے اور تم یہ پسند نہ کرو

---

۱۔ الدھر ۷۶: ۳۔

۲۔ البلد ۹۰: ۱۰۔



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ دوسرے لوگ اُسے جانیں [3]۔ نفس انسانی کا یہی پہلو ہے جسے قرآن نے نفس لوامہ [4] سے تعبیر کیا ہے اور پھر پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ، وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ.(القیامہ ۷۵:۱۴-۱۵)

''بلکہ حق یہ ہے کہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ وہ اپنے لیے کتنے ہی بہانے بنائے۔''

(میزان ۲۰۲-۲۰۳)

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں ودیعت کیا جانے والا یہ فطری شعور کسی خارجی رہنمائی کے بغیر بھی از خود اپنے اظہار کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ چنانچہ جب جنت میں ممنوعہ پھل کھانے کے نتیجے میں آدم و حوا علیہما السلام کے ستر ان پر کھل گئے تو انھوں نے فوراً اپنے آپ کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ قرآن مجید سے واضح ہے کہ ایسا انھوں نے کسی باقاعدہ 'حکم' کی تعمیل میں نہیں، بلکہ شرم و حیا کے اس فطری احساس کی بنا پر کیا تھا جو اللہ نے ان کی فطرت میں ودیعت کر رکھا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۲۲ کی تفسیر میں اسی بات کی وضاحت کی ہے۔ مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

''...'وَطَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَـنَّةِ' کے اسلوب بیان سے اس گھبراہٹ اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا ہے جو اس اچانک حادثے سے آدم و حوا پر طاری ہوئی۔ جوں ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہ ننگے ہو کر رہ گئے ہیں، فوراً انھیں اپنی ستر کی فکر ہوئی اور جس چیز پر ہاتھ پڑ گیا، اسی سے ڈھانکنے کی کوشش کی، چنانچہ کوئی چیز نہیں ملی تو باغ کے پتے ہی اپنے اوپر گانٹھنے گوتھنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر کا احساس انسان کے اندر بالکل فطری ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے، شرک انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے، اسی طرح حیا فطرت ہے، بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۳۶)

مولانا مودودی نے بیان کیا ہے:

''انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرتاً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے

---

۳۔ مسلم، رقم ۶۵۱۶۔

۴۔ القیامہ ۷۵: ۲۔

اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ در حقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔‘‘

(تفہیم القرآن ۲/۱۵)

ہابیل اور قابیل کے واقعے سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کے قتل کے بعد جو پشیمانی اور ندامت محسوس کی، اس کا سبب وحی نہیں، بلکہ ایک داخلی احساس تھا جو ظاہر ہے کہ فطرت ہی کی ہدایت پر مبنی تھا۔ مولانا اصلاحی نے اس واقعے کے حوالے سے لکھا ہے:

’’... خدا پر ایمان، خدا کی عبادت، عبادت کے لیے اخلاص و تقویٰ کی شرط، عدل کا تصور، قتل نفس کا جرم ہونا، جنت اور دوزخ کا عقیدہ، یہ سب چیزیں انسان کی ابتداے آفرینش ہی سے اس کو تعلیم ہوئی ہیں۔ ان کا عہد جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی اور اس کی امت سے لیا ہے، اسی طرح آدم اور ان کی ذریت سے بھی لیا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائی انسان حق و عدل کے ان تصورات سے بالکل خالی تھا جو اب اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۴۹۳)

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com